مقالات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۱)

از سعید احمد اکبر آبادی

فرض کیجئے آپ نے اپنا ایک گھر بڑی تمناؤں اور آرزوں سے بنایا ہے۔ جس میں موجودہ زمانہ کی تمام سہولتیں اور آسانیاں فراہم ہیں۔ یہ مکان بنایا تو دراصل آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کی آسائش و راحت کے لئے تھا۔ لیکن آپ کے تعلقات وسیع تھے۔ اس لئے آپ کے دوست احباب جو ہر مذہب و ملت کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ ان کے لئے اس مکان کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ یہ لوگ آتے تھے اور بے تکلف تھوڑے بہت دن یہاں مقیم رہ کر مکان کی آسائشوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مکان بہر حال آپ کا تھا۔ اس کا درد بست دیکھ بھال اور نگرانی یہ سب آپ کی تھی۔ آپ اس حالت میں کس اطمینان اور خود اعتمادی سے رہتے تھے۔ لیکن ایک دن صبح کو جب آپ کی آنکھ کھلی تو اچانک معلوم ہوا کہ ملک میں انقلاب آگیا ہے۔ جاگیر جائداد اور املاک کے قاعدے اور قانون بدل گئے ہیں، اور ان قوانین کے ماتحت آپ کے مکان پر کسٹوڈین کا قبضہ ہوگیا ہے آپ رہیں گے اب بھی اسی مکان میں وہ مکان ہوگا۔ اب بھی آپ کے نام سے منسوب! بلکہ آپ اس مکان میں پہلے سے زیادہ وسعت اور آرام کا و آسائش کا سامان ہوگا۔ فرنیچر بھی پہلے سے زیادہ قیمتی اور بافراط ہوگا۔ لیکن در و بست اور اس کا انتظام کسٹوڈین کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو ہو سکتا ہے کہ آپ کا بھائی بند ہی ہو اور غیر نہ ہو۔ فرمایئے! اگر آپ کے مکان ساتھ یہ معاملہ پیش آئے تو آپ کو طبعی طور پر صدمہ اور رنج ہوگا یا نہیں؟ ہوگا۔ اس بنا پر ہم کو شروع میں ہی یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) بل ۱۹۷۲ء سے جو حال میں ہی پارلیمنٹ سے منظور ہوکر صدر کی تصدیق وتوثیق کے بعد نافذ ہوا ہے مسلمانوں کو عام طور پر مایوسی ہوئی ہے اور اس یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ جوان کو گہرا تعلق اور جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ اس کو شدید ٹھیس لگی ہے جس سے وہ بلبلا اٹھے اور سراسیمہ ومضطرب ہو گئے ہیں۔ لیکن زمانہ سدا یکساں نہیں رہتا۔ وہ بدلتا ہے۔ تو سماج کی قدریں بدلتی ہیں۔ رہن سہن اور آپس کے علائق وروابط کے قاعدے قانون اور ضابطے بدلتے ہیں۔ اور اس وقت وہی لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو وقت کی دیوار پر ان لکیروں کو پڑھکر جدید دور کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کی کوشش بیدار مغزی اور روشن دماغی کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی اور وہ زمانہ کے ساتھ آگے بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کا بل موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے تاریخ کا ایک نہایت اہم موڑ ہے۔ اور ان کی آئندہ نسلوں پر اس کے بہت دور رس اثرات پڑیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان جذباتیت سے الگ ہوکر حقیقت پسندی کی نظر سے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس یونیورسٹی کے ماضی اور حال کا جائزہ لیں اور اس کی روشنی میں یہ طے کریں کہ مستقبل میں جو امکانات ہیں۔ ان سے کس طرح عہدہ برا ہو سکتے ہیں زمانہ کا آہنگ بدلا ہے تو انہیں بھی اپنے نغمہ کے لیے ایک ایسی لے تلاش کرنی ہوگی جو اس آہنگ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔ قومی مسائل و معاملات کبھی جذباتیت کی راہ سے طے نہیں ہوتے ترجمانِ حقیقت نے اسی لئے کہا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

اب آئیے پہلے اسی یونیورسٹی کے ماضی کا جائزہ لیں۔

<u>سرسید کا نصب العین</u> | اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ۱۸۷۵ء میں سرسید نے جو ایم او کالج قائم کیا تھا۔ اگرچہ اس کا دروازہ غیر مسلموں پر کبھی بند نہیں ہوا چنانچہ سرسید کی زندگی

میں اس کالج سے جو ایک سو ہیں طلبا گریجویٹ ہوئے ان میں ۹۷ مسلمان تھے اور باقی ۲۳ ہندو۔ لیکن اس کالج کے قیام کا اصل مقصد مسلمانوں کو تعلیم جدید سے بہرہ یاب کرنا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے ۱۸۵۷ء کے حوادث وواقعات کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا تھا انگریزوں کے جذبۂ انتقام اور غیظ وغضب کا نشانہ سب سے زیادہ یہی بنے تھے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی پسماندگی کا منظر نہایت دردانگیز اور تشویش افزا تھا۔ اس لیے سرسید نے اپنی زندگی مسلمانوں کی تعمیر وترقی اوران کی تشکیل نو کے لئے وقف کردی۔ فرقہ پرستی اور قوم پروری میں صرف ایک باریک فرق ہے اگر سرسید یہ سب کچھ اس نیت اور اس ارادے سے کرتے کہ انہیں مسلمانوں کو ہندؤوں کا مدمقابل اور برابر کا حریف بنانا ہے تو وہ فرقہ پرست کہلاتے۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ جسم کا اگر کوئی ایک عضو کمزور رہ جائے تو پورے جسم کو تندرست نہیں کہا جا سکتا۔ تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ سرسید کا یہ عمل قوم پرورانہ نہیں تھا۔ اور اس سے پوری ہندوستانی قوم اور ملک کو فائدہ پہونچنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ سرسید کی پوری زندگی ان کے اسی بلند اور نیک ارادہ ومقصد کی ترجمان ہے۔ اس زمانہ میں جو انصاف پسند ہندو تھے وہ سرسید کی اس عظمت فکر وعمل کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال کی دیواروں میں جن چندہ دینے والوں کے نام کندہ ہیں آپ دیکھیں گے ان میں ہندؤوں کے نام بھی ہیں ایک طرف سرسید کی بلند نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندؤں کو اپنی ایک آنکھ کہتے تھے۔ اور دوسری جانب ہندوؤں میں سرسید کی پذیرائی اس درجہ تھی کہ جالندھر میں جب ان کو ہندوؤں کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا تو اڈریس میں صاف طور پر اس کا اعتراف کیا گیا تھا کہ سرسید صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی لیڈر ہیں۔ بہرحال سرسید نے یہ کالج اصلاً اور حقیقتہً مسلمانوں کے لیئے بنایا تھا اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ عمل آج کل کے اصطلاحی معنی میں فرقہ پرستانہ تھا۔

چونکہ مسلمان مذہب کے بغیر رہ نہیں سکتے اور اس کا تحفظ اور اس کے احکام کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ اس بنا پر سرسید نے کالج میں انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم کے ساتھ دینیات اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ اسلامی شعائر اور اسلامی تہذیب و روایات کے تحفظ و بقا اور ان کی نشو و نما کے لئے جو چیزیں ضروری تھیں ان کے بھی انتظامات کئے اور اس طرح انہوں نے مسلمان نوجوانوں کی اسلامی تربیت کو بھی ان کی تعلیم کا لازمی جز قرار دیا۔ انہیں وجوہ کی بنا پر سرسید کے نزدیک تعلیم کے لئے اقامتی زندگی ناگزیر تھی۔ سرسید نے ایک موقع پر بڑی صفائی اور قوت سے کہا ہے: "کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے" انہیں ان مسلمانوں پر سخت غصہ آتا تھا جو اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں بھیجتے تھے کہ وہاں تعلیم خواہ کتنی ہی اعلیٰ اور عمدہ ہو۔ لیکن بچے اپنے دین سے منحرف ہو جاتے تھے۔ ایک لکچر میں کس سوز و گداز اور درد سے کہتے ہیں۔ "مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ان کو غیرت نہیں آتی" (لکچروں کا مجموعہ میں ۱۵۸)

سرسید کا یہ کالج صرف ایک تعلیم گاہ نہیں تھا۔ بلکہ درحقیقت انیسویں صدی کے ربع آخر میں ایک ایسی ہمہ گیر اور نہایت توانا تحریک تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا اور ان کی حیات ملی و قومی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا۔ جو اس تحریک سے متاثر نہ ہوا ہو۔ عجب اتفاق ہے سرسید نے جب اپنی تحریک شروع کی تو یہ زمانہ عالم اسلام میں بحران کا زمانہ تھا چنانچہ اسی زمانہ میں ترکی، مصر، انڈونیشیا، ایران اور مراکو اور نائجیریا میں بھی اصلاحی تحریکیں اور بڑے بڑے مفکر اور مصلح پیدا ہوئے۔ لیکن سرسید نے جن حالات میں تحریک شروع کی۔ اس کو جس طرح کامیاب بنایا اور اس تحریک نے مسلمانوں میں جو انقلاب عظیم برپا کیا۔ اگر ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر سرسید کا موازنہ

اس زمانے میں عالمِ اسلام کے دوسرے مفکرین و مصلحین سے کیا جائے. تو بے مبالغہ مجموعی حیثیت سے سرسید سب سے زیادہ قدآور ثابت ہوں گے، یوں تو اس دنیا کی ریت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی حیاتِ مستعار کی ہر راحت و آسائش قربان کر کے ایک چیز ایجاد کرتا ہے پوری دنیا اس ایجاد سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے. لیکن اس کے مرجانے کے بعد تاریخ کی چند کتابوں کے علاوہ دنیا اس شخص کا نام تک بھول جاتی ہے اس لیے اگر آج سرسید کو بھی لوگ بھول گئے تو اس پر حیرت اور اسی کا شکوہ کس سے اور کیوں کر کیجئے.

سرسید کے ذہن میں یونیورسٹی کا تصور سرسید ایسا حوصلہ مند شخص یونیورسٹی سے کم کس چیز پر قانع ہو سکتا تھا! چنانچہ ان کا اصل ارادہ یونیورسٹی ہی قائم کرنے کا تھا. مولانا حالی لکھتے ہیں.

سید محمود نے جو اسکیم ۱ر فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی. اس میں انہوں نے صاف صاف اس بات کی تصریح کر دی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے. پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے. اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیئے. اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے. (حیاتِ جاوید جلد اوّل) اس یونیورسی کی نسبت سرسید کے عزائم اور مقاصد کس درجہ بلند اور اعلیٰ تھے. اس کا اندازہ ان کی ایک تحریر کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہوگا فرماتے ہیں :-

"یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے. ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں. اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں. جو ٹکڑا ٹیڑا علم کا وہ دیتی ہے اس کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں. اور اس پر قناعت کرتے ہیں. اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی. یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی. ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنے قومی علوم پھیلائیں گے. فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا. سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ

محمد رسول اللہ کا تاج سر پہ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو پھر بنا تی ہے ۔

اس کے بعد نہایت صفائی سے فرمایا۔

اے دوستو! میں خود بھی انہی میں ہوں۔ کیونکہ مجھکو ایک یونیورسٹی نے ال۔ال۔ڈی۔ کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی! (حیات جاوید ج ۱۰۶)

سرسید کی یہ تقریر اور اس کے علاوہ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اور کہا ہے اس سب کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سرسید جس قسم کی یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کی خصوصیات حسب ذیل تھیں۔

(۱) یہ یونیورسٹی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے طرز پر ہوگی۔ اس بنا پر اس کے لئے اقامتی کردار اس کا جزو لاینفک ہوگا اور اس کا معیار تعلیم وہی ہوگا جو ان یونیورسٹیوں کا ہے۔ فرق صرف اسی قدر ہوگا کہ ان یونیورسٹیوں میں عیسائی عقائد اور مغربی تہذیب کی تعلیم ہوتی ہے اور اس یونیورسٹی میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جائے گی۔ اور اس کی فضا اسلامی تہذیب کی ہوگی۔

(۲) اس مقصد کے پیش نظر مغربی علوم و فنون اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں اسلامی علوم و فنون اور دینیات کا درس بھی ہوگا۔

(۳) یونیورسٹی حکومت کے کنٹرول اور اس کی مداخلت سے بالکل آزاد ہوگی۔

(۴) اس یونیورسٹی کا انتظام تعلیم تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اس معاملہ میں وہ کسی کے تابع نہیں ہوں گے۔

(۵) اس مقصد کے لئے یونیورسٹی کے تمام اخراجات کا تکفل مسلمانوں کو خود کرنا چاہیے۔ گورنمنٹ کی امداد پر بھروسہ کرنا یونیورسٹی کے مقاصد سے اغراض برتنا ہے۔

تعلیمی خودمختاری و آزادی ان دفعات میں ہمارے مقصد کے پیش نظر دفعات (۳۔۴۔۵) زیادہ اہم ہیں جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یونیورسٹی حکومت کی

مداخلت سے آزاد ہو گی. مسلمان اپنی تعلیم کے خود مالک اور اس کے اخراجات کے خود متکفل ہوں گے. درحقیقت سرسید کی یہ رائے تعلیم سے متعلق اسلامی فکر کی بالکل صحیح ترجمان ہے۔ اسلام میں تعلیم دین کی ہو یا امورِ دنیویہ کی ایک نہایت مقدس اور ضروری فریضۂ انسانی ہے اس بنا پر اس کو بالکل آزاد اور حکومت وغیرہ کے دباؤ سے محفوظ ہونا چاہیئے. اور ساتھ ہی خدمتِ بنی نوعِ انسان کے علاوہ اس کو ذریعۂ معشیت بنانا ایک مشہور مثل کے مطابق کشمیر کی بنی ہوئی ایک نہایت قیمتی شال سے جوتوں کے صاف کرنے کا کام لینا ہے. پوری تاریخ اسلام میں تعلیم سے متعلق اربابِ علم اور اصحابِ درس و تعلیم کا تعامل اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تعلیمی نظام کو حکومت کے اثر سے ہمیشہ آزاد رکھا ہے. چنانچہ اسی علی گڑھ کالج سے دو تین برس بیشتر دیو بند میں مدرسہ قائم ہوا تو اس کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے مدرسہ سے متعلق اپنے وصیت نامہ میں جو اب تک محفوظ ہے. مدرسہ کے اربابِ انتظام کو سخت تاکید کی کہ مدرسہ کا تعلق حکومت سے (چاہے اپنی ہو یا غیروں کی) ہرگز کسی قسم کا نہ ہو. اور نہ گورنمنٹ کی کوئی گرانٹ منظور کی جائے [1]

---

[1] الحمد للہ دار العلوم دیوبند آج بھی جب کہ اس کا سالانہ بجٹ تیرہ لاکھ روپے ہے اپنی اس وضع پر قائم ہے میری طالب علمی کے زمانے کی بات ہے. ایک مرتبہ سر میاں محمد شفیع اور سر میاں فضل حسین جو اس زمانے میں وائسرائے کی اکزکٹو کونسل کے ممبر تھے. دیو بند تشریف لائے ان کے اعزاز میں مدرسہ کے نودرہ میں ایک جلسہ ہوا. سر میاں محمد شفیع نے (مجھے اب یہ یاد نہیں کہ دونوں حضرات ساتھ آئے تھے. یا یکے بعد دیگرے) نے اپنی تقریر میں مدرسہ اور اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی اور پھر حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے فرمایا. گورنمنٹ کی بڑی خواہش ہے کہ وہ مدرسہ کو گرانٹ دے. یہ گرانٹ بغیر کسی شرط کے ہو گی. اس سے مدرسہ کو ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ علماء کو ریلوے کنسیشن مل جائے گا. اسی سلسلہ میں انہوں نے وہ بات بھی کہی جو آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی کردار کے متعلق عام طور پر کہتے ہیں (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

سرسید کے دل کی یہی پکار تھی جس کا اظہار ان کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہند رح کی زبان سے اس وقت ہوا جب کہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کرتے ہوئے آپ نے علی گڑھ کی جامع مسجد میں فرمایا:۔

"ضرورت اس کی ہے کہ وہ (جدید) تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثر سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں میں غلام پیدا کرتے رہیں۔ بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے"

(جوہر جامعہ جوبلی نمبر ص ۱۵۳)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷ انہوں نے کہا: آپ حضرات کو گورنمنٹ سے گرانٹ لینے میں تامل کیا ہے؟ گورنمنٹ آپ کو جو روپیہ دے گی یہ تو وہی روپیہ ہے جو وہ آپ سے وصول کرتی ہے۔ اس تقریر کے جواب میں مدرسہ کی طرف سے حضرت الاستاد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح نے ایک نہایت فصیح و بلیغ اور پُر مغز تقریر کی اور مدرسہ کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے سر شفیع کی بات کے رد میں فرمایا: جی ہاں آپ نے بجا فرمایا کہ گورنمنٹ گرانٹ کی صورت میں جو روپیہ ہم کو دے گی وہ دراصل ہمارا یعنی ملک و قوم کا ہی روپیہ ہوگا۔ لیکن یہ روپیہ جن ہاتھوں سے ہم کو ملے گا اس میں ان ہاتھوں کے اثر کا آجانا ضروری ہے۔ اور ہم مدرسہ کو اس اثر سے محفوظ رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں، سب جانتے ہیں۔ مولانا ایک نہایت بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ اس لئے انہوں نے روپیہ میں ہاتھوں کے اثر کا فلسفہ ایسے موثر اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا کہ حاضرین پر اس کا بڑا اثر ہوا اور سر شفیع پھر کچھ نہ کہہ سکے اور اپنے مشن میں ناکام واپس ہوئے۔ یہ واقعہ انگریزوں کے زمانہ کا تھا۔ اب آزادی کے بعد کا [بقیہ صفحہ ۱۹ پر]

ایک عبرت انگیز واقعہ قومی حمیت وغیرت۔ عزت نفس اور خودداری کا بھی وہ مقام رفیع و بلند تھا کہ جب کبھی ہم نے اسے نظرانداز کیا ہے۔ غیروں سے بے محابا طعنے سنے اور ذلتیں اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا حالی نے ایک سخت عبرت انگیز واقعہ لکھا ہے انہیں کی زبان سے سنیئے۔ فرماتے ہیں:-

"جب دوسری بار سید محمود (فرزند سرسید) تفریحاً انگلستان کو گئے اور کیمرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اور آج کل ارادہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸ کا) ایک واقعہ سنیئے۔ غالباً ۵۲ء ۵۳ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت اتر پردیش میں سمپورانند جی وزیر تعلیم تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور راقم الحروف ہم تینوں سمپورانند جی سے ملاقات کے لئے ان کے مکان پر گئے۔ حسب معمول بڑے تپاک سے ملے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ اب جب کہ ملک آزاد ہوگیا اور ایک قومی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی گرانٹ پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ مولانا محمد طیب صاحب نے فوراً جواب دیا "سمپورانند جی اگر حکومت مسلمانوں کی بھی ہو تب بھی ہم مدرسہ کے بانی کی وصیت کے مطابق کوئی گرانٹ منظور نہیں کرسکتے، ہمارا اصول ہی یہ ہے کہ ہماری تعلیم ہر قسم کے بیرونی اثر اور دباؤ سے آزاد رہے۔ اس کے بعد صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم دیوبند تشریف لے گئے۔ لیکن الحمدللہ مدرسہ آج تک اپنی اسی وضع پر قائم ہے۔ درحقیقت یہ بھی وہ خاکساران جہاں ہیں جن کی نسبت مولانا شبلیؒ نے فرمایا تھا:-

اے کہ پرسی چہ کسانیم وچہ ساماں داریم + آنچہ با ہیچ نیرزد بجہان آں داریم
ما نہ آنیم کہ بر شیوۂ ارباب حشم + روئے دارا ہے بعہد دولت سلطاں داریم
خاکساران جہانیم وز اسباب جہاں + بوریائیست کہ در کلبۂ احزاں داریم

یہ ہو رہا ہے کہ چرچ متعلقہ ٹرینیٹی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت عظیم الشان عمارت از سر نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے بر سبیل تذکرہ اپنے دوست سے کہا کہ اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اس کی ضرورتوں سے بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرستہ العلوم (علی گڑھ) ہی کی امداد کے لیے دے دیں۔ ان کے دوست نے کہا: ”ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟“ سید محمود نے کہا۔ چھ کروڑ“ وہ (انگریز دوست) سن کر نہایت متعجب ہوا۔ اور یہ کہا: ”جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہوں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے ان کی اعانت کرنی گناہ ہے ان کو تباہ ہونے دو!“ (حیات جاوید ج ا ص ۱۵۸)

یہ نوٹ کر لیجئے کہ آج بھی ہندوستان میں مسلمان کچھ زیادہ چھ کروڑ ہی ہیں۔ اور بدقسمتی سے ان کے تعلیمی مسائل آج بھی وہی ہیں جو مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تاسیس کے وقت تھے۔ وائے ماماندگی شوق وہی داماں آرزو! قومیں کہاں سے کہاں پہونچ گئیں ہم ان تیز گام کی گرد کاروان بھی نظر نہیں آتی اور ہم پوری ایک صدی کے بعد بھی آج وہیں ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا!

ہر پھر کے ایک ہی دائرہ میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں!!

سر سید کی مایوسی اور ناکامی یہ وہ وقت تھا جب کہ کوئی شخص لعقہ بھی حکومت کی اجازت کے بغیر نہ توڑ سکتا تھا۔ اور یونیورسٹی کا معاملہ تو ایسا تھا کہ حکومت اگر اس کو تسلیم نہ کرے تو اس کا وجود ہی معتبر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر یونیورسٹی اور اس کے مقاصد سے متعلق گورنمنٹ کو لکھا گیا۔ لیکن اس نے مسلم یونیورسٹی کے نام سے یونیورسٹی کے قیام کی اجازت اور اس کو گرانٹ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔ ”لوکل گورنمنٹ سے

اس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے۔ تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ اِن ایڈ نہیں دینے کی، باوجود اس کے سرسید کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی۔ اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا۔ تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی، لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسہ پر قائم کرنا آسان کام نہ تھا نہ طالب علم اور نہ ان کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونیوالا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں۔ قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے کو ہی فوز عظیم سمجھا جائے۔ الغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ یونیورسٹی کا خیال انہوں نے بالکل چھوڑ دیا۔

(حیاتِ جاوید ج ۱ ص ۱۷۳-۱۷۴)

مدرستہ العلوم علی گڑھ کا قیام سرسید کو اپنے تصور اور جذبہ و ولولہ کے مطابق یونیورسٹی کے منصوبہ میں اگرچہ مایوس اور ناکام ہونا پڑا تھا۔ لیکن وہ حالات سے بد دل ہو کر جی چھوڑ دینے والے انسان نہیں تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سخت مجبور کن اور صبر آزما حالات میں بھی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ کرنا چاہیئے اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے:۔
مَا لَا یُدرَکُ کُلُّہٗ لَا یُترَکُ کُلُّہٗ، یعنی جس چیز کو تمام و کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کو تمام ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے بقول مولانا حالی کے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی ہے کہ:۔

نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک ✤ تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

اور ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم قائم کردیا جو بعد میں مسلم اینگلو اورنٹیل کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کالج میں سرسید کو مجبوراً کورس تو وہی اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیوں کا مجوزہ اور ان کے ہاں رائج تھا لیکن ایک اس کورس سے قطع نظر مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے یونیورسٹی کے سلسلہ میں سرسید کا اور جو کچھ منصوبہ تھا اس کو انہوں نے کالج کی راہ سے مکمل کرنے کا پختہ عزم کرلیا۔ سرسید کے سامنے یونیورسٹی کا جو ایک اعلیٰ منصوبہ تھا۔ اس کا ایک جز یہ بھی تھا کہ گورنمنٹ کے اثر سے اس کو آزاد رکھا جائے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے مولانا حالی کی زبان سے ابھی سنا اس وقت کے مسلمانوں کے پیش نظر ان ہونی بات تھی۔ اس لئے سرسید نے جب یونیورسٹی کا خیال ترک کیا تو اب گورنمنٹ سے بے تعلقی کے بارے میں بھی اپنا نقطۂ نظر بدل لیا کہ شیخ سعدی رح ایسے ناصح مشفق کی نصیحت ہے "زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز" چنانچہ کالج کے سلسلہ میں سرسید نے جو کچھ کیا اس کا اگر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو ان سب کا مقصد تین چیزیں ہی نظر آتی ہیں۔

(۱) کالج میں اگرچہ کورس وہی ہوگا جو اور یونیورسٹیوں میں اور خصوصاً الہ آباد یونیورسٹی میں مروج ہے لیکن اس کورس کی تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ ہونی چاہئے اور اگر اس کے لئے بیش قرار تنخواہوں پر یورپین اسٹاف درکار ہو تو اس میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) کالج کے لئے گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ایک طرف گورنمنٹ کی امداد و اعانت سے کالج ترقی کرے اور اس کے کام آگے بڑھیں، اور دوسری جانب کالج کے فارغ التحصیل طلباء کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں سہولت اور آسانی ہو اور وہ حکومت کے معتمد علیہ بن سکیں۔

(۳) کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ دینیات اور اسلامی شعار اور روایات کی ایسی فضا پیدا کی جائے کہ علوم جدیدہ کے اثر سے مسلمان نوجوانوں کے مذہبی عقائد متزلزل نہ ہوں۔ اور

وہ کردار، اخلاق اور عمل کے اعتبار سے پکے سچے مسلمان رہیں۔

راہ کی مشکلات لیکن سرسید کا کام آسان نہیں تھا۔ راہ میں سخت مشکلات اور دشواریاں حائل تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ۱۸۷۰ء میں انگلستان کے سفر سے واپس آنے کے دو ماہ بعد ہی انہوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی اصلاح کی غرض سے تہذیب الاخلاق کے نام سے جو رسالہ جاری کیا تھا اس میں ان کے قلم سے ایسے متعدد مذہبی مضمون شائع ہو چکے تھے۔ جنہوں نے ان کے مذہبی افکار و عقائد سے متعلق مسلمانوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور غیظ و غضب کے جذبات پیدا کر دئے تھے۔ چنانچہ سرسید کی طرف سے کالج کی سکیم کا شائع ہونا تھا کہ ان کی مخالفت کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ ان کی تذلیل و تنقیص میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا اور عام طور پر کہا یہ گیا سرسید یہ کالج مسلمان نوجوانوں کو عیسائی بنانے کی غرض سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ علماء سرسید سے کس درجہ بدگمان تھے ؟۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے درخواست کی گئی کہ وہ مجوزہ مدرسہ میں دینیات کی تعلیم کا انتظام اپنی صوابدید سے کریں تو مولانا نے جواب دیا۔ "سرسید اس مدرسہ کے کاموں سے دست بردار ہو جائیں تب مذہبی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری باب پنجم میں ۲۱۶)

چندہ کی فراہمی لیکن سرسید کو یقین تھا کہ ایک وہ قوم جو عرصۂ دراز سے جمود ذہنی اور اس کے باعث جہالت و عصبیت میں گرفتار ہو اس کی --- اصلاح پھولوں کی سیج نہیں ہے اس راہ میں قدم قدم پر ان کو عوائق و موانع سے سابقہ ہوگا۔ سرسید نے ان سب پر عبور پانے عزم بالجزم کر لیا تھا۔ چنانچہ مخالفتوں کے ان طوفانوں میں وہ مدرسۃ العلوم کے لئے چندہ کرنے کے واسطے نکل کھڑے ہوئے۔ اور کالج کی لگن میں انہوں نے نہ اپنی صحت کا خیال کیا۔ نہ اچھے برے کا امتیاز برتا۔ نہ لوگوں کے سب و شتم اور ان کے لعن طعن کی پروا

کی۔ جہاں کہیں جاتے درد دل کی کہانی اسی سوز وگداز سے سناتے۔ کہ مخالفوں کے دل بھی نرم ہو جاتے تھے۔ کالج کے قیام کا ایک جنون تھا جو ان کے دل و دماغ پر سوار تھا۔ اور جس نے ان کو پارہ صفت مضطرب و بے قرار بنا دیا تھا۔ سفر کے درمیان لوگ ان کے اعزاز میں دعوتیں اور پارٹیاں کرنی چاہتے تھے تو دعوت کے بجائے اس کے خرچ کا روپیہ بھی چندہ میں وصول کر لیتے۔ شادی بیاہ کی تقریب میں دولہا کو جو روپیہ ملتا وہ مدرسہ فنڈ کے لیے ہتیا لیتے۔ حد یہ ہے اس کار خیر کے لئے انہوں نے ایک ناٹک بھی کر ڈالا اور آپ خود سوانگ بھی بھرا نیکی کا کام بہر حال کار نیک ہے اس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں۔ چنانچہ چندہ دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور عیسائیوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بہرحال اسی طرح دن رات ایک اور اپنے آپ کو فنا کر کے ——

بیس برس کی مدت میں سات آٹھ لاکھ (جو اب یقیناً ایک کروڑ سے کم نہیں) کی عمارت تیار ہو گئی اور کالج کی سالانہ آمدنی اسّی ہزار تک پہونچ گئی یہی وہ عمارت ہے جس کو دیکھ کر ایرانی سیاح نے کہا تھا: خدا کی قسم یہ تو معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ جو کام سلطنتوں سے نہیں ہو سکتا اسے تنہا ایک شخص نے کیسے کر دکھایا!" (حیات جاوید ص ۱۷۵) لیکن یہ سب کچھ تو بعد میں ہوا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جب مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کی صدارت میں اس مدرسہ کا افتتاح اور چھاؤنی کے پرانے بنگلوں میں ایک ماہ بعد ہی یعنی یکم جون کو مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا تو اس وقت کچھ بھی پاس نہ تھا۔ سرسید اس زمانے میں سرکاری ملازم تھے۔ پوری فضا تیرہ و تار تھی۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ آج جس مدرسہ کا آغاز اس بے سروسامانی کے عالم میں ہو رہا ہے۔ کل وہ ایشیا کی ایک عظیم یونیورسٹی ہو گا۔

سرسید کی انتہا پسندی اور بے اعتدالیاں اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید کا یہ کارنامہ اس درجہ عظیم الشان، انقلاب آفریں، اور تاریخ ساز ہے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام روشن رہے گا۔ اور تاریخ کے صفحات ان کی شخصیت کو فراموش نہیں کر سکیں گے

لیکن آج جب کہ ہم سو برس کی مسافت طے کر چکے ہیں اور اس مدت میں یہاں کیسے کیسے انقلابات آتے رہے اور یہ مدرسہ نشیب و فراز کی کیسی کیسی وادیوں سے گذرتا رہا۔ ایک ناقد مورخ کا فرض ہے کہ ان سو برسوں کا جائزہ لے کر یہ بتائے کہ مدرسہ نے اپنے اس طویل سفر میں کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے؟ کہاں اس سے کیا غلطی ہوئی ہے؟ اور کیوں! اس کے اسباب کیا تھے؟ آج ہندوستان کے مسلمان تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں۔ فہم بصیرت اور عزم و ہمت کے ساتھ اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتے جب تک وہ اپنے ماضی کا جائزہ اشخاص و افراد کی رُو رعایت کے بغیر، دیدہ وری کے ساتھ نہیں لیں گے۔ یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ ملک کی تقسیم نے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے فنِ تاریخ نویسی کو بھی بہت نقصان پہونچایا ہے اور اس فن کے لئے جس معروضی (OBJECTIVE) نقطۂ نظر کی ضرورت ہے وہ مجروح ہوگیا ہے۔ چنانچہ تقسیم کے بعد سے اب تک سرسید کے عہد سے متعلق ہندوستان اور پاکستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں معروضی نقطۂ نظر کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔ پاکستان کا مورخ سرسید کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا وہ قومی نظریہ کے بانی مبانی وہی تھے۔ اور ان کے تمام کام ہندوؤں کے بالمقابل مسلمانوں کو اونچا کرنے کی غرض سے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے ہندوستان کے مسلمان مورخ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرسید ایک خالص ہندوستانی اور نیشنلسٹ تھے انہوں نے جو کچھ کیا ہندوستانی قوم کے لئے کیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سرسید کی جدوجہد یا برادرانِ وطن کی تنگ نظری سے مجبور ہوکر انہوں نے جو راہ اختیار کی اس کا تذکرہ زبان قلم پر لاتے ہوئے ان کو شرم آتی یا ڈر لگتا ہے۔ ان میں ایک ہندو دشمنی کا مینڈرلون ہے اور دوسرا احساس کمتری کا شکار! یہ غیر معروضی طریق تاریخ نویسی ذہن کے ساتھ انصاف ہے۔ نہ سرسید کے ساتھ اور نہ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ!!